موت و حیات

اقبال کے کلام میں

مرتبہ

ڈاکٹر محمد رضی الدین صدیقی ایم اے، پی ایچ ڈی،

اقبال اکیڈمی

۴۵ (الف) سرکلر روڈ بیرون موچی گیٹ لاہور

قیمت ۶ر

Ram Babu Saksena Collection

بار دوم — دسمبر ۱۹۴۴ء — ایک ہزار

دین محمدی پریس لاہور میں باہتمام ملک محمد عارف خاں پرنٹر طبع کرکے سید محمد شاہ
ایم۔ اے نے دفتر اقبال اکیڈمی ۴۵ (الف) میکلوڈ روڈ بیرون موچی گیٹ لاہور
سے کتاب ہذا کو شائع کیا

کلمۃ للناشر

جناب پروفیسر محمد رضی الدین صاحب صدیقی ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن کے شعبۂ ریاضی کے اعلیٰ پروفیسر ہیں آپ نے آج سے دو سال قبل ریاضی میں ایک لاکھ روپیہ کا "نوبل پرائز" جیت کر دنیائے علم و سائنس میں شہرت دوام حاصل کی تھی مسلمانوں کے لئے علاوہ دوسری باتوں کے یہ امر انتہائی مسرت کا موجب ہے کہ ہمارا نوجوان ریاضی دان صرف ریاضی دان ہی نہیں ہے بلکہ ایک باعمل اسلامی فلاسفر اور ادیب بھی ہے۔ آپ نے ترجمانِ حقیقت علامہ ڈاکٹر اقبال رح کے کلام کا گہرا اور مکمل مطالعہ کیا ہے اور اپنے تاثرات کو حیدرآباد دکن کی ایک علمی مجلس کے سامنے متعدد بار مقالات کی شکل میں ظاہر کیا ہے۔ اُن مقالات میں سے دو مقالے ڈاکٹر صاحب کی اجازت سے اقبال اکیڈمی شائع کرنے کا فخر حاصل کر رہی ہے۔ ان میں سے ایک تو آپ کے ہاتھ میں ہے اور دوسرا وہ ہے جو آپ نے "اقبال ڈے" منعقدہ اپریل سنہ ۱۹۴۲ء کے موقعہ پر بنام "اقبال کا تصور زمان و مکان" کے نام سے پڑھا تھا۔ دونوں مقالات بحمد اللہ شائع ہو گئے ہیں۔ انتہا افسوس ضرور ہے کہ اگر کاغذ کی گرانی اور نایابی کا مسئلہ درپیش نہ ہوتا تو یہ جواہر پارے ہم آج سے ایک سال قبل ہی شائقین کے خزانوں کو بھرپور کر چکے ہوتے۔ انشاءاللہ اسکے بعد بھی ڈاکٹر صاحب موصوف کی بعض دوسری چیزیں جلد پیش کرنے کا فخر حاصل کرونگا۔

محمد شاہ (ایم۔ اے)

ایفائے وعدہ

"موت و حیات" کا پہلا ایڈیشن پیش کرتے وقت میں نے وعدہ کیا تھا کہ ڈاکٹر صاحب کی بعض دوسری چیزیں بھی عنقریب پیش کرونگا - الحمد للہ آج پورے ایک سال کے بعد خدا کے فضل و کرم سے اُس وعدہ کو پورا کر رہا ہوں - میں نے ڈاکٹر صاحب کی شہرۂ آفاق تصنیف "تعلیم کا مسئلہ" حال ہی میں شائع کی ہے - اس بے نظیر کتاب میں جناب پروفیسر صاحب نے تعلیم کا ایک انقلابی تصوّر پیش کیا ہے جس سے امید ہے کہ اگر مسلمانوں نے اس کی طرف توجہ کی تو اُن کی قومی بدبختی کے دن ختم ہو جائینگے - یہ کتاب ہر پروفیسر، ہر طالب علم، ہر باپ اور ہر ماں کو ضرور پڑھنی چاہیئے تاکہ وہ اپنے عزیزوں اور اپنے بچوں کو تعلیم کے صحیح راستہ پر لا سکیں +

۱۵ دسمبر ۱۹۴۴ء

"محمد شاہ" کان اللہ لہٗ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

موت و حیات

اقبال نے اپنی بیمار قوم کی حالت پر نظر ڈال کر معلوم کر لیا کہ جو کہنہ امراض قوم کو اندر ہی اندر کھائے جا رہے ہیں ان میں ایک خطرناک مرض موت کا وہ ڈر ہے جو ہر کس و ناکس کے دل و دماغ پر چھایا ہوا ہے یہ خوف مرگ "وہ بلا ہے کہ اگر یہ کسی قوم کو لگ جائے تو وہ قوم عزت اور آزادی کی موت پر بے عزتی اور غلامی کو ترجیح دیتی ہے۔ اور پھر وہ پستی اور ذلت کے ایسے گہرے گڑھے میں گر جاتی ہے جہاں اس کو اغیار کی ٹھوکروں کے سوا کچھ نصیب نہیں ہوتا۔ اقبالؒ نے اس خوف و ہراس کے خلاف مسلسل جہاد کیا اور بار بار یہ نکتہ سمجھانے کی کوشش کی کہ اگر ہم بحیثیت ایک قوم زندہ رہنا چاہتے ہیں۔ تو ہمیں موت سے ذرہ بھی نہیں ڈرنا چاہئے۔ انفرادی اور اجتماعی تاریخ کا مطالعہ کریں تو ہم دیکھیں گے کہ جو شخص یا جو گروہ کچھ نمایاں کام کر گیا ہے جس کا دل موت کے خوف سے خالی تھا۔ اقبالؒ ہمیں یاد دلاتے ہیں کہ ہمارے اسلاف نے مشرق و مغرب پر اپنا سکہ جما دیا اور انسانی

تہذیب و تمدّن کے ہر شعبے میں حیرت انگیز ترقیاں کیں تو اُس کی ایک بڑی
وجہ یہ تھی کہ وہ خوف کے احساس سے پاک تھے۔ اور اپنی ہتھوں میں سر کو ہتھیلی
پر لیئے پھرتے تھے۔ یا اب یہ حال ہے کہ موت کے اندیشہ سے ہمارا دل کانپتا
رہتا ہے۔ اور ہمارا جسم ہلدی کی طرح زرد ہو جاتا ہے۔ اس خوف سے ہم اس
قدر مغلوب ہو گئے ہیں کہ ہمارے مرشدانِ خود بین قوم کو اپنی بے بسی کی
طرف توجہ دلانے کے بجائے فتوے دے رہے ہیں کہ یہ زمانہ ہی ایسا ہے
کہ اس میں تلوار کی ضرورت نہیں رہی۔ جنابِ شیخ سے اقبالؒ عرض کرتے
ہیں کہ مسجد میں آپ کا یہ وعظ غیر ضروری ہے۔ کیونکہ ؎

تیغ و تفنگ دستِ مسلماں میں ہے کہاں — ہو بھی تو دل ہیں موت کی لذت سے بے خبر
کافر کی موت سے بھی لرزتا ہو جس کا دل — کہتا ہے کون اُسے کہ مسلماں کی موت مر

اقبالؒ متعدد موقعوں پر مختلف پیرایوں میں یہ نکتہ سمجھاتے ہیں کہ موت
کا ڈر صرف اُن لوگوں کو ہو سکتا ہے جو اس کو فنائے کامل سمجھتے ہیں۔ اور
آخرت پر یقین نہیں رکھتے لیکن جو لوگ موت کو آئندہ زندگی کا پیش خیمہ
سمجھتے ہیں، انہیں مرنے کی کچھ پرواہ نہیں ہوتی۔ دنیائے اسلام کا سب سے
بڑا فتنہ یہی ہے کہ جن کی حیات و موت خدا کے لئے ہونی چاہیئے تھی وہ
یا تو مال و زر کی محبت میں گرفتار ہیں، یا موت کے خوف سے
پریشان ؎

آں کہ بود اللہ او را ساز و برگ　　فتنۂ او حبِ مال و ترسِ مرگ
ہمچو کافر از اجل ترسندۂ　　سینہ اش فارغ ز قلبِ زندۂ
مرگ را چوں کافراں داند ہلاک　　آتش او کم بہا مانند خاک

غرض اقبالؒ کو جب یقین ہو جاتا ہے کہ موت کے خوف کا یہ زہر ہمارے خون میں سرایت کر چکا ہے تو اس کے اثر کو زائل کرنے کے لئے وہ مختلف تریاق استعمال کرتے ہیں اور ہر طرح ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ موت سے ہمیں کوئی ڈر نہیں ہونا چاہیئے۔

اس ضمن میں وہ سب سے پہلے موت کے عالمگیر اور اٹل ہونے کی طرف ہماری توجہ مبذول کرتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ جب موت سے کسی طرح مفر نہیں تو پھر اس سے ڈرنا بے سود ہی نہیں بلکہ خلافِ عقل بھی ہے جو چیز آج نہیں تو کل آنے والی ہے اس سے بھاگ کر کہاں جائیں ہر جاندار کے لئے موت کا ایک دن مقرر ہے اور کائنات کی ہر شئے کبھی نہ کبھی فنا ہو گی ؎

نہ گردوں را مقام دلپذیر است　　ولیکن مہر و ماہش زود میر است
بدوشِ شام نعشِ آفتابے　　کواکب را کفن از ماہتابے
پر و کہسار چوں ریگِ روانے　　دگرگوں مے شود دریا بآنے
فنا را بادۂ ہر جام کردند　　چہ بے دردانہ او را عام کردند

تماشہ گاہ مرگ ناگہاں را
جہان مادہ و انجم نام کردند

موت کے ہمہ گیر اور دنیا کے دور روزہ ہونے کے لئے ذیل کے اشعار بھی نفس تشبیہی دی ہیں ؎

زندگی انساں کی ہے مانند مرغ خوشنوا
شاخ پر بیٹھا کوئی دم چہچہایا اڑ گیا

آہ! کیا آئے ریاض دہر میں ہم کیا گئے
زندگی کی شاخ سے پھوٹے کھلے مرجھا گئے

اے ہوس! خوں رو کہ ہے یہ زندگی بے اعتبار
یہ شرارے کا تبسم یہ خس آتش سوار

آہ! یہ دنیا یہ ماتم خانہ برنا و پیر
آدمی ہے کس طلسم دوش و فردا میں اسیر

کس قدر مشکل زندگی ہے کس قدر آساں ہے موت
گلشن ہستی میں مانند نسیم ارزاں ہے موت

کلبۂ افلاس میں دولت کے کاشانے میں موت
دشت و در میں شہر میں گلشن میں ویرانے میں موت

جب یہ معلوم ہو گیا کہ غنیم موت کی یورش کبھی نہیں ٹل سکتی اور موت ہر شاہ و گدا کے خواب کی تعبیر ہے تو پھر اس کا ڈر ہی کیا - اور اس سے بچا کر کہاں جائیں - اس حقیقت پر پہنچ جانے کے بعد اقبال اب اس راز کا افشا کرنا چاہتے ہیں کہ خدا نے اس کائنات کو فانی بنایا ہی کیوں اور انسان کو اس رنج و غم میں مبتلا ہونے پر مجبور کیوں کیا - باری تعالیٰ خود غیر فانی ہے تو پھر اس کی قدرت سے کیا بعید تھا کہ وہ اس دنیا کو اور اس کے ساتھ انسان کو بھی غیر فانی بناتا - اس مطلب کو ایک پھول کی زبانی وہ اس طرح ادا کرتے ہیں ؎

مرا روزے گلِ افسردۂ گفت
نمودِ ما چو پرواز شرار است
دلم بر محنتِ نقش آفریں سوخت
کہ نقش کلکِ او ناپائیدار است

اس کا جواب ایک دوسری رباعی میں وہ اس طرح دیتے ہیں کہ یہ دنیا اور آدمِ خاکی ابھی ناتمام ہیں۔ یہ پختہ اسی وقت ہوتے ہیں جب موت کی آگ میں سے ہو کر نکلتے ہیں۔ موت کا سوہان ہمارے اس ناتمام پیکر کو درست کر دیتا ہے ۔

جہانِ ما کہ جز انگارۂ نیست
اسیرِ انقلاب صبح و شام است
ز سوہانِ قضا ہموارہ گردد
ہنوز ایں پیکرِ گل ناتمام است

رنج و غم انسانی فطرت کی تکمیل کے لئے ضروری ہیں۔ کوئی نقش اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتا جب تک اس کے رنگ میں خونِ جگر کی آمیزش نہ ہو۔ وہ بلبل ہی کیا ہے جس نے کبھی خزاں نہ دیکھی ہو۔ وہ نغمہ ہی کیا جس میں نالہ کی چاشنی نہیں۔ غم کے داغوں سے ہمارے سینے منور ہوتے ہیں اور آہوں کی صیقل سے ہمارے دلوں کا زنگ دور ہوتا ہے۔ جو گلچیں کانٹوں کی خلش سے بالکل ناواقف ہوں اور جن عاشقوں نے کبھی ہجر کی کلفت نہ سہی ہو وہ زندگی کی لذت سے محروم ہیں اور زندگی کا راز ان کی نظروں سے پوشیدہ ہے۔ غم کے اس نکتہ کو اقبال نے جن شعروں میں بیان کیا ہے وہ فلسفیانہ معنویت اور لطافت کے لحاظ سے بہترین

شمار کئے جا سکتے - یہ وہ شعر ہیں جو ہر زبان کے لئے مایۂ ناز ہیں ؎

گو سراپا کیفِ عشرت ہے شرابِ زندگی　　اشک بھی رکھتا ہے دامن میں سحابِ زندگی

موجِ غم پر رقص کرتا ہے حبابِ زندگی　　ہے الم کا سورہ بھی جزوِ کتابِ زندگی

(اس شعر میں ایک طرف الم تو غم کی تعبیر کرتا ہے - اور دوسری طرف قرآن شریف کے سورۂ الم کی طرف اشارہ کرتا ہے) ؎

ایک بھی پتی اگر کم ہو تو وہ گل ہی نہیں

جو خزاں نادیدہ ہو بلبل وہ بلبل ہی نہیں

غم جوانی کو جگا دیتا ہے لطفِ خواب سے

ساز یہ بیدار ہوتا ہے اسی مضراب سے

طائروں کے لئے غم شہپرِ پرواز ہے

راز ہے انساں کا دل غم انکشافِ راز ہے

غم نہیں غم روح کا اک نغمۂ خاموش ہے

جو سرودِ بربطِ ہستی سے ہم آغوش ہے

ہاتھ جس گلچیں کا ہے محفوظ نوکِ خار سے

عشق اس کا بے خبر ہے لذتِ آزار سے

کلفتِ غم گرچہ اس کے روز و شب سے دور ہے

زندگی کا راز اس کی آنکھ سے مستور ہے

اقبالؒ بار بار یہی سکھاتے ہیں کہ انسان کو اس دنیا میں حضر سے بڑھ کر سفر میں لذت ملتی ہے۔ اور وصل سے بڑھ کر فراق میں چنانچہ ایک جگہ لکھتے ہیں ؎

عالم سوز و ساز میں وصل سے بڑھ کے ہے فراق
وصل میں مرگ آرزو ہجر میں لذت طلب

انتہا یہ ہے کہ ان کے نزدیک حسن کا کمال بھی اسی میں ہے۔ کہ وہ زوال پذیر ہو۔ اس نکتہ کو انہوں نے خدا اور حسن کے مابین ایک مکالمہ کی شکل میں پیش کیا ہے ؎

خدا سے حسن نے ایک روز سوال کیا — جہاں میں تو نے مجھے کیوں نہ لازوال کیا
ملا جواب کہ تصویر خانہ ہے دنیا — شب دراز عدم کا فسانہ ہے دنیا
ہوئی ہے رنگ تغیر سے جب نمود اسکی — وہی حسیں ہے حقیقت زوال ہے جس کی

غرض اسی طرح وہ سمجھاتے ہیں کہ موت ہو یا رنج و غم ان کی شکایت کے لئے ہماری زبان نہیں کھل سکتی کیونکہ اس گلستان میں نئے سرے سے بہار آنے کے لئے ضروری ہے کہ خزاں سے ان کے پھولوں اور پھلوں کو پامال کیا جاوے۔ غم کی حقیقت کو آشکار کر دینے کے بعد وہ بتاتے ہیں کہ ظاہر پرست انسان جس کو موت کہتے ہیں وہ دراصل فنا نہیں بلکہ آئندہ زندگی کا پیش خیمہ ہے۔ لوگ جس کو زندگی کی شام سمجھتے ہیں۔ وہ دراصل اسکی دائمی صبح ہے ؎

موت کو سمجھے ہیں غافل اختتامِ زندگی
ہے یہ شامِ زندگی صبحِ دوامِ زندگی

موت کی منزل سے گزرنے کے بعد انسان کو وہ زندگی حاصل ہوتی ہے جو خضر کو اپنی عمرِ دراز میں بھی نصیب نہیں۔ دنیا کی بے ثباتی ایک سطحی منظر ہے جس کی تہ میں وہی زندگی کی روح کارفرما ہے نقشِ حیات ہر مرتبہ مٹنے کے بعد ایک نئی شان سے اُبھرتا ہے۔ فنا اور عدم کی اس کثرت میں صرف زندگی کی وحدت جلوہ گر ہے ؎

دمادم رواں ہے یمِ زندگی
ہر اک شے سے پیدا رمِ زندگی

فریبِ نظر ہے سکون و ثبات
تڑپتا ہے ہر ذرۂ کائنات

ٹھہرتا نہیں کاروانِ وجود
کہ ہر لحظہ ہے تازہ شانِ وجود

سمجھتا ہے تو راز ہے زندگی
فقط ذوقِ پرواز ہے زندگی

اُلجھ کر سلجھنے میں لذت اسے
تڑپنے پھڑکنے میں راحت اسے

از کر جہاں مکافات ہیں
رہی زندگی موت کی گھات ہیں

گل اس شاخ سے ٹوٹتے بھی رہے
اسی شاخ سے پھوٹتے بھی رہے

سمجھتے ہیں ناداں اسے بے ثبات
اُبھرتا ہے مٹ مٹ کے نقشِ حیات

"حیات بعد الموت" فلسفۂ اسلام کا ایک بنیادی عقیدہ ہے اقبال رح کے مرشدِ معنوی مولانا روم بھی اپنی مثنوی میں جا بجا مسئلہ ارتقاء کا ذکر کر کے بتلاتے ہیں کہ انسان ہر فنا کے بعد ارتقا کا ایک نیا درجہ طے کرتا ہے اور پہلے

سے بہتر حالت میں نمودار ہوتا ہے ؎

تو ازاں روزے کہ در ہست آمدی　　آتشے یا خاک یا بادے بُدی

گر بداں حالت ترا بودے بقا　　کے رسیدی مر ترا ایں ارتقا

از مبدّل ہستیٔ اوّل نماند　　ہستیٔ دیگر بجائے او نشاند

ایں بقاہا از فناہا یافتی　　از فنا پس رُو چرا برتافتی

زاں فناہا چہ زیاں بودت کہ تو　　بر بقا چسپیدۂ اے بے نوا تو

صد ہزاراں حشر دیدی اے عنود　　تاکنوں در لحظہ از بدو وجود

در فناہا ایں بقاہا دیدۂ　　بر بقائے جسم چوں چسپیدۂ

میں نے اپنے اُس لیکچر میں جو لاہور کی کلچرل ایسوسی ایشن میں دیا گیا اور جو رسالے "اسلامک کلچر" بابت جنوری سنہ ۱۹۴۰ء میں شائع ہوا ہے تفصیل سے بتلایا ہے کہ ارتقا کا سائنسی نظریہ مسلمانوں کے لئے کوئی نئی چیز نہیں بلکہ جاحظ اور ابن مسکویہ نے دسویں صدی عیسوی میں پرندوں کے مطالعہ کے بعد اس نظریہ کی تشکیل کی تھی تصوف اور علم کلام میں حیات بعد الموت کے ثبوت میں اس کو دلیل کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ چنانچہ حضرت اکبرؒ نے بھی اس استدلال سے کام لیا ہے۔ جب وہ کہتے ہیں ؎

عبث ہے نظم بلیغ فطرت جو رُخ نہ ہو حسن مدعا کا
حدیث محشر اگر غلط ہے تو کیا نتیجہ ہے ارتقا کا

اقبالؒ اس نکتے سے اچھی طرح واقف ہیں اور متعدد وجدآفریں تشبیہوں
کے ذریعہ ثابت کرتے ہیں کہ ہر جامِ فنا میں شرابِ زندگی کی مستی بھری ہوئی
ہے۔ وہ ایک ستارہ کے ٹمٹمانے کو کانپنے سے تعبیر کرتے ہیں۔ اور اس
سے پوچھتے ہیں کہ کیا تجھے قمر کا خوف ہے یا سحر کا خطرہ لگا ہوا ہے کہ تو تمام
رات کانپتے ہوئے گزارتا ہے۔ شاید تجھے مآلِ حسن کی خبر مل گئی ہے کہ
جب چاند نکلے گا یا سحر ہوگی تو تیری ہستی نابود ہو جائے گی۔ پھر اس چمکنے
والے مسافر کو سمجھاتے ہیں کہ اس دنیا کا آئین یہی ہے۔ کلی کی موت میں پھول
کی آفرینش کا راز پوشیدہ ہے۔ اور لاکھوں ستاروں کے فنا ہونے سے
ایک آفتاب کی ولادت واقع ہوتی ہے ؎

اجل ہے لاکھوں ستاروں کی اک ولادتِ مہر
فنا کی نیند مے زندگی کی مستی ہے
وداعِ غنچہ میں ہے رازِ آفرینشِ گل
عدم عدم ہے کہ آئینہ دارِ ہستی ہے

شام کے سناٹے میں دریائے راوی کے کنارے وہ عالمِ خیال
میں محو کھڑے ہوئے ہیں۔ اتنے میں ایک کشتی تیزی کے ساتھ دریا میں چلتی
نظر آتی ہے۔ اور تھوڑی دیر کے بعد نظروں سے اوجھل ہو جاتی ہے۔
ان کا حکمت شناس دل اس معمولی واقعہ سے کس قدر گہرا نتیجہ اخذ کرتا ہے ؎

جہازِ زندگیٔ آدمی رواں ہے یونہیں   ابد کے بحر میں پیدا نہیں ہے یونہیں
شکست سے یہ کبھی آشنا نہیں ہوتا   نظر سے چھپتا ہے لیکن فنا نہیں ہوتا

ایک ندی کو دیکھئے جب اس کی چادر پہاڑ کی بلندی سے وادی کی چٹانوں پر گرتی ہے تو بہ ظاہر اس کا تسلسل ٹوٹ جاتا ہے اور پانی کی مسلسل رو کی بجائے آبشار کے قریب بکھری ہوئی بوندوں کی ایک دنیا نظر آتی ہے۔ لیکن آبشار سے تھوڑی دور آگے وادی میں بڑھیں تو پھر وہی ندی بہتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ زندگی کی لہر بھی اسی طرح رواں ہے جس پر ان انسانی حادثات کا کوئی اثر نہیں ہو سکتا ؎

ایک اصلیت میں ہے نہرِ روانِ زندگی
گر کے رفعت سے ہجومِ نوعِ انساں بن گئی
جوہرِ انساں عدم سے آشنا ہوتا نہیں
آنکھ سے غائب تو ہوتا ہے فنا ہوتا نہیں

یہ ہمارا جسمِ خاکی ہماری روح کی حیات کاری کے لئے عارضی محمل ہے تو ہمیں نالہ و فریاد کرنے کی کوئی وجہ نہیں کیونکہ ؎

زندگی کی آگ کا انجام خاکستر نہیں   ٹوٹنا جس کا مقدر ہو یہ وہ گوہر نہیں

حفظِ زندگی کی خواہش ہر جاندار کی فطرت میں ودیعت کر دی گئی ہے اور کشمکشِ حیات دنیا کا عام اصول ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ خود قدرت

کو بھی زندگی بہت محبوب ہے۔ پس اگر موت کے ہاتھوں سے نقش حیات مٹ سکتا تو قدرت اس کو کائنات میں اس طرح عام نہ کر دیتی۔ موت کا اس طرح عالمگیر اور ارزاں ہونا ہی خود اس بات کی دلیل ہے کہ زندگی پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑتا ہے

ہے اگر ارزاں تو یہ سمجھو اجل کچھ بھی نہیں
جس طرح سونے سے جینے میں خلل کچھ بھی نہیں

موت کے رازِ نہاں کو سمجھنے کے لیئے ایک اور مثال پر غور کیجیئے۔ ساحل دریا پر کھڑے ہوئے ہم ہوا اور پانی کے اس مسلسل کھیل کو دیکھتے ہیں جس سے بلبلے پیدا ہوتے اور ٹوٹتے رہتے ہیں۔ موج مضطر حباب کی تعمیر بھی کرتی ہے اور پھر بڑی بے دردی سے اس نقش کو مٹا کر اپنے دامن میں چھپا لیتی ہے نقش کی یہ ناپائداری اس بات کا ثبوت ہے کہ ہوا میں ان بلبلوں کو پیدا کرنے کی قوت ہے۔ اگر یہ قوتِ تعمیر اس میں موجود نہ ہوتی تو وہ اس کو توڑنے میں اس قدر بے پروا کبھی نہیں ہوتی۔ قدرت اگر ایک کائنات کو فنا کرتی ہے تو دوسری کائنات پیدا بھی کر سکتی ہے۔

ایک اچھا شاعر اپنے شعر سے خوش نہیں ہوتا۔ تو اسے چھوڑ کر دوسرا شعر کہتا ہے۔ ایک بڑا مصنف اپنے مضمون میں اس وقت تک کانٹ چھانٹ کرتا رہتا ہے جب تک وہ اس کے دل خواہ معیار پر پورا نہ اترے کوئی

تعمیر جب تک اچھی طرح تکمیل نہیں ہونے پاتی مصوّر اُس کو بدلتا رہتا ہے
پھر قدرت جو سب سے بڑی آرٹسٹ ہے اپنے نامکمل نقش سے کس
طرح مطمئن ہو سکتی ہے۔ موت کی اس قدر لطیف توجیہہ اقبال کے سوا
شاید ہی کسی دوسرے شاعر کے ہاں ملے اگر قدرت اِس پیکرِ خاکی کو فنا کرتی
ہے تو اِس لئے کہ وہ ایک خوب تر پیکر بنانے کی آرزومند ہے ؎

فطرتِ ہستی شہیدِ آرزو رہتی نہ ہو
خوب تر پیکر کی اس کو جستجو رہتی نہ ہو

طبعی سائنس میں انسان ایک نہایت ہی حقیر ہستی ہے جس کی اس
کائنات میں کوئی اہمیت نہیں لیکن مذہب یہ سکھلاتا ہے کہ انسان اشرف المخلوقات
ہے اور یہ ساری کائنات اسی کے لئے پیدا کی گئی ہے۔ اگر یہ صحیح ہے تو ان
ستاروں پر غور کیجئے جو کروڑوں برس سے منوّر ہیں جن کی عمر کا حساب لگاتے
ہوئے ہماری عقل چکرا جاتی ہے۔ ان کا مقابلہ انسان سے کیجئے جس کی نظر ان
ستاروں سے بھی آگے ہمیشہ آنسوئے افلاک رہتی ہے جس کی وسعتِ فطرت
میں آسمان ایک نقطہ سے زیادہ نہیں جس کی زندگی کا مقصد فرشتوں سے بھی
زیادہ پاکیزہ ہے جس کے دم سے محفلِ قدرت میں روشنی ہے جس نے اُس
بارِ امانت کو اُٹھایا جس کے متحمل زمین اور آسمان بھی نہیں ہو سکے۔ اگر ستاروں
کی زندگی اس قدر طویل ہے تو انسان جس کا ناخن سازِ ہستی کو چھیڑتا ہے

کیا وہ ایک لحظہ میں فنا ہو جائے گا؟ کیا وہ ان چمکدار ذروں سے بھی کم قیمت ہے کہ ستارے تو اتنے عرصہ تک چمکتے ہیں اور انسان کی ہستی ایک لمحہ میں فنا ہو جائے ؎

شعلہ یہ کمتر ہے گردوں کے شراروں سے بھی کیا؟
کم بہا ہے آفتاب اپنے ستاروں سے بھی کیا؟

پھول کے ایک بیج کی حقیقت پر غور کیجئے اس کو مٹی میں دبا دیا جاتا ہے لیکن اس کے باوجود وہ سردی مرقد سے افسردہ نہیں ہوتا خاک میں رہنے کے بعد بھی اس کا سوز کم نہیں ہو جاتا، زیر خاک بھی وہ نشو و نما کے واسطے بیتاب رہتا ہے۔ اس کی ہستی میں زندگی کا جو شعلہ پنہاں ہے وہ مٹی کے اس انبار سے نہیں دب سکتا، خود نمائی اور خود افزائی کے لئے وہ یہاں تک مجبور ہے کہ آخر کار بیج کا یہ دانہ گل کی شکل میں نمودار ہو جاتا ہے ؎

پھول بن کر اپنی تربت سے نکل آتا ہے یہ
موت سے گویا قبائے زندگی پاتا ہے یہ

ہے لحد اس قوت آشفتہ کی شیرازہ بند
ڈالتی ہے گردنِ گردوں میں جو اپنی کمند
موت تجدید مذاق زندگی کا نام ہے
خواب کے پردے میں بیداری کا اک پیغام ہے

موت اس گلشن میں جز سنجیدنِ پر کچھ نہیں　　خوگرِ پرواز کو پرواز میں ڈر کچھ نہیں

رات کے وقت ساری کائنات اس طرح مراقبے میں ہوتی ہے کہ معلوم ہوتا ہے ہر چیز پر موت کا جادو چل گیا ہے لیکن جب صبح ہوتی ہے تو اس دنیا کا ذرہ ذرہ نئی زندگی کے لئے بیدار ہوتا ہے پس اگر ہر شام کے بعد صبح کا ہونا لازمی ہے تو پھر ہماری شبِ عدم کی صبح کیوں نہ ہو؟ کس قدر روح پرور شعر ہے ؎

یہ اگر آئینِ ہستی ہے کہ ہو ہر شام صبح　　مرقدِ انساں کی شب کا کیوں نہ ہو انجام صبح

غرض ہم قدرت کے کسی مظہر پر غور کریں ہمیں زندگی ہی زندگی نظر آئیگی۔ موت صرف ایک عارضی حادثہ ہے جس کی دہلیز سے گزر کر ہم زندگی کی ایک دوسری منزل میں قدم رکھتے ہیں یہ دنیا ہمارے امتحان و ترقی کا ایک زینہ ہے آسمانوں کے نو پردوں کے آگے بھی بہت دور ہیں جن سے ہم کو گزرنا پڑے گا۔ یہ نشیمن خاکی ہو یا عالم آخرت دونوں ہماری زندگی کی جولانگاہ ہیں ؎

وہ فرائض کا تسلسل نام ہے جس کا حیات　　جلوہ گاہیں اس کی ہیں لاکھوں جہانِ بے ثبات

مختلف ہر منزلِ ہستی کی رسم و راہ ہے　　آخرت بھی زندگی کی ایک جولانگاہ ہے

انسان کا حلقۂ فکر اس قدر تنگ نہیں کہ وہ اس جسم خاکی کو ہماری حقیقی ہستی کے لئے ناگزیر سمجھے اس دنیا میں ہمارا کام ختم نہیں ہو جاتا بلکہ یہ تو عشق کی پہلی منزل ہے۔ اس لئے آگے ابھی بہت سی منزلیں طے کرنی ہیں ذیل کی نظم زبان اور خیالات کے لحاظ سے تخلیقی آرٹ کی ایک بہترین مثال ہے ؎

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں — ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں
تہی زندگی سے نہیں یہ فضائیں — یہاں سینکڑوں کارواں اور بھی ہیں
قناعت نہ کر عالمِ رنگ و بو پر — چمن اور بھی آشیاں اور بھی ہیں
اگر کھو گیا اک نشیمن تو کیا غم — مقاماتِ آہ و فغاں اور بھی ہیں
تو شاہیں ہے پرواز ہے کام تیرا — ترے سامنے آسماں اور بھی ہیں
اسی روز و شب میں الجھ کر نہ رہ جا — کہ تیرے زمین و مکاں اور بھی ہیں

اس کے علاوہ افراد مٹ سکتے ہیں لیکن نسل و قوم باقی رہتی ہے۔ بادِ نسیم کی روح آفرینیوں کی بدولت کلی شاخِ گل سے چٹکتی ہے لیکن ابھی پوری طرح کھلنے بھی نہیں پاتی کہ گلچیں کے ظالم ہاتھوں اس کا خون ہو جاتا ہے۔ اور بوئے گل کی طرح اس کو چمن سے باہر نکل جانا پڑتا ہے۔ قمری کے آشیاں پر بجلی گر پڑتی ہے بلبل صیاد کے دام میں پھنس جاتی ہے لیکن بہار کی رونق کم نہیں ہوتی۔ ہزاروں جانور اپنی اپنی بولی بول کر اڑ جاتے ہیں لیکن یہ چمن اسی طرح قائم رہتا ہے سے

فصلِ گل از نسترن باقی تر است — از گل و سرو و سمن باقی تر است
کانِ گوہر پرورے گوہر گرے — کم نگردد از شکستِ گوہرے
صبح از مشرق ز مغرب شام رفت — جامِ صد روز از خمِ ایام رفت
بادہ ہا خوردند و صہبا باقی است — دوشہا خوں گشت و فردا باقی است
ہمچناں از فرد ہائے بے سپر — ہست تقویمِ امم پایندہ تر

درسفر یاراست و صحبت قائم است　　فرد رہ گیراست وملت قائم است

امتِ مرحومہ خدا کی ایک نشانی ہے اور اغیار اس نورِ الٰہی کو بجھانے کے درپے ہیں لیکن پاسبانی کرنے والے نے اس کی حفاظت کا وعدہ کیا ہے اور جب تک کہ تخلیق عالم کے مقصد کی تکمیل نہ ہو جائے اور صداقت اور توحید کا پرچم ساری دنیا پر نہ لہرانے لگے یہ امت اسی طرح زندہ رہے گی ؎

تو نہ مٹ جائیگا ایران کے مٹ جانے سے　　نشۂ مے کو تعلق نہیں پیمانے سے
ہے عیاں یورش تاتار کے افسانے سے　　پاسباں مل گئے کعبہ کو صنم خانے سے
کشتیٔ حق کا زمانے میں سہارا تو ہے　　عصرِ نو رات ہے دھندلا سا ستارا تو ہے
چشمِ اقوام سے مخفی ہے حقیقت تیری　　ہے ابھی محفلِ ہستی کو ضرورت تیری
زندہ رکھتی ہے زمانے کو حرارت تیری　　کوکبِ قسمتِ امکاں ہے خلافت تیری

وقتِ فرصت ہے کہاں کام ابھی باقی ہے
نورِ توحید کا اتمام ابھی باقی ہے

یہی وجہ ہے کہ اگرچہ آسمان ہمارے ساتھ ہمیشہ برسرِ پیکار رہا اور ہمارے سر پر وہ وہ مصیبتیں نازل کیں جو یونان اور روما نے بھی نہیں دیکھیں۔ اور جن کے باعث سطوتِ مسلم خاک و خون میں تڑپنے لگی لیکن ہم اس امتحان سے کبھی نہیں گھبرائے ہر مشکل کا مقابلہ کیا اور ابراہیم خلیل اللہ کی طرح آگ کو بھی اپنے لئے گلزار بنا لیا۔ پھر اگرچہ مصر و بابل مٹ گئے نہ صفحۂ دہر پر اس کا

نشان باقی ہے اور نہ دفتر ہستی میں اُن کی داستان لیکن مسلم کی اذان فضائے عالم میں اب بھی اُسی طرح گونجتی ہے۔

از تہ آتش بر اندازیم گُل ! | تا بہ ہر ہرمزد ہ را سازیم گِل
شعلہ ہائے انقلاب روزگار | چوں بباغ ما رسد گردد بہار
رومیاں را گرم بازاری نماند | آں جہاں گیری جہانداری نماند
شیشۂ ساسانیاں در خوں نشست | رونق خمخانۂ یونان شکست
مصر ہم در امتحاں ناکام ماند | استخوانِ او تہ اہرام ماند
در جہاں بانگِ اذاں بود است و ہست | ملتِ اسلامیاں بود است و ہست

اجل کا ہاتھ ہماری قوم کو چھو نہیں سکتا اور چونکہ قوم کی ہستی میں ہی افراد کو حقیقی زندگی نصیب ہوتی ہے اس لئے قوم کی خاطر قربان ہو جانے میں کسی قسم کی جھجک نہیں ہونی چاہیئے۔

ایک سچے عاشق کو موت سے کوئی ڈر نہیں کیونکہ اگرچہ موت ہر چیز پر غالب آتی ہے لیکن عشق پر غالب نہیں آتی "ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما" کی اس قدیم حقیقت کو اقبال نے عشق اور موت کے فرشتوں کی اچانک ملاقات کے لطیف پیرایہ میں بیان کیا ہے عشق کا فرشتہ جنت کی سیر کو جا رہا تھا کہ رستے میں موت کے فرشتے سے اُس کی مُٹھ بھیڑ ہوتی ہے۔ دونوں ایک دوسرے سے بالکل ناواقف ہیں۔ فرشتہ موت کی کریہہ صورت کو دیکھ کر عشق کا فرشتہ پوچھتا

ہے کہ تو کون ہے؟ وہ جواب دیتا ہے کہ میں اجل ہوں، رشتۂ ہستی کے پرزے
اُڑاتا اور زندگی کی چنگاری کو بجھاتا ہوں میری آنکھیں جادوئے نیستی اور
اشارے میں پیامِ فنا ہے لیکن دنیا میں ایک ہستی ایسی ہے کہ وہ آگ ہے
اور میں اُس کے سامنے پارا ہوں ؎

سنی عشق نے گفتگو جب قضا کی ‏ ‏ ہنسی اس کے لب پر ہوئی آشکارا
گری اس تبسم کی بجلی اجل پر ‏ ‏ اندھیرے کا ہو نور میں کیا گزارا
بقا کو جو دیکھا فنا ہو گئی وہ ‏ ‏ قضا تھی شکارِ قضا ہو گئی وہ

عشق اور موت کے فرشتوں کی ایک اور ملاقات کا ذکر میں نے ایک
جرمن نظم میں پڑھا تھا اور چونکہ یہ ایک عجیب چھوٹا مضمون ہے اس لئے میں مناسب
سمجھتا ہوں کہ اس کو مختصر طور پر یہاں بیان کردوں عشق کا فرشتہ اپنی
پیہم محنت سے تھک کر ترکش کو کمر سے کھولے ہوئے آرام کر رہا ہے اور
جامِ شراب کے پینے میں مشغول ہے موت کا فرشتہ اپنی تیر و کمان کو لئے ہوئے
شکار کی فکر میں ادھر سے گزرتا ہے عشق کا فرشتہ آواز دیتا ہے دوست تم
اس قدر جلدی میں کہاں چلے۔ اہلِ جہاں کو تھوڑی مہلت اور مل جائے تو تمہارا
کیا بگڑ جائیگا۔ آؤ کچھ دیر آرام کرو اور چند جام تم بھی نوش کرو۔ موت کا فرشتہ
بھی اپنی ترکش کو کھول کر رکھ دیتا ہے اور دونوں خوب پی کر مدہوش ہو جاتے ہیں
تھوڑی دیر بعد وہ اس مدہوشی اور غفلت سے چونکتے ہیں۔ اور گھبرا کر اٹھ کھڑے

ہوتے ہیں تاکہ اپنی اپنی مہم پر روانہ ہوں جلدی سے تیر اور کمان سمیٹ کر اپنے اپنے راستہ پر نکل جاتے ہیں لیکن بہت دیر نہیں گزرتی کہ دونوں حیرت کے مارے مبہوت ہو جاتے ہیں عشق کا فرشتہ دیکھتا ہے کہ جس نوجوان پر اس نے تیر چلایا تھا وہ عشق و محبت کے سمندر سے کھیلنے کی بجائے موت کا شکار ہو جاتا ہے اسی طرح موت کا فرشتہ یہ دیکھ کر دنگ ہو جاتا ہے کہ جس بوڑھے کو نشانۂ اجل بنانا چاہتا تھا وہ مرنے کی بجائے عشق و ہوس کے فریب میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اس وقت ان فرشتوں کو احساس ہوتا ہے کہ انکے تیر بدل گئے ہیں موت کے چند تیر فرشتہ عشق کی ترکش میں آ گئے ہیں اور عشق کے چند تیر فرشتہ موت کی ترکش میں۔ شاعر نے اس لطیف پیرایہ میں جوانی کی موت اور بڑھاپے کی عاشقی دونوں کی توجیہ کی ہے۔

اقبالؒ کہتے ہیں کہ موت کا فرشتہ اگرچہ ہمارے جسم سے جان نکال لیتا ہے لیکن ہمارے وجود کے مرکز تک اسکی رسائی نہیں ہوتی ہمارا زندہ دل قبر میں بھی بیقرار رہتا ہے

اگر ہو زندہ تو دل ناصبور رہتا ہے — لحد میں بھی یہی غیب و حضور رہتا ہے

ترے وجود کے مرکز سے دور رہتا ہے — فرشتہ موت کا چھوتا ہے گو بدن تیرا

اس جسم خاکی کے مر جانے سے جان نہیں مرتی۔ دل حلقۂ بود و عدم سے آزاد ہے

چہ غم داری حیات ہم زدم نیست — کہ دل در حلقۂ بود و عدم نیست

غبارے کم نظر اندیشۂ مرگ — اگر دم رفت دل باقی است غم نیست

دنیا کی ساری چیزیں فنا ہو جائیں لیکن جوہر انسان کی حقیقت کچھ اور ہے اسکو فنا ممکن نہیں

سریر کیقباد و اکلیل جم خاک کلیسا و بتستان و حرم خاک
ولیکن من ندانم گوہرم چیست نگاہم برتر از گردوں تنم خاک

سحر کے وقت شاعر کے حساس دل میں ہر جاندار اور بے جان چیز سے پیام قبول کرنے کی قابلیت بڑھ جاتی ہے وہ صبح کے تاروں کو اپنا درد دل سنانے کیلئے فضائے دشت میں گھوم رہا ہے راکھ کے ایک ڈھیر سے اس کو کچھ سرگوشیوں کی آواز سنائی دیتی ہے راکھ باد صبا سے کہہ رہی ہے کہ "کبھی میں بھی بھڑکتی ہوئی آگ تھی جس سے راہرو اپنے جسم کیلئے گرمی حاصل کرتے تھے لیکن اس صحرا کی ہواؤں نے میری چنگاریوں کو ٹھنڈا کر دیا تو اب آہستہ چل تاکہ میرے یہ افسردہ ذرے بکھر نہ جائیں۔ ورنہ جس قافلے کے سوز و گداز کی میں نشانی ہوں اس کی یاد بھی باقی نہ رہ سکے گی" یہ سن کر شاعر کو اپنی حالت یاد آتی ہے۔ وہ سوچتا ہے کہ اس کی ہستی بھی خاک سے زیادہ نہیں اور وہ بھی اس رہگزر میں پڑا ہوا ہے باد حوادث کی تباہ کاریوں کے خیال سے اس کی آنکھ سے بے اختیار آنسو بہنے لگتے ہیں۔ اتنے میں اس کے کان میں دل کی یہ آواز پہنچتی ہے کہ اس مشت خاک کی تباہی پر کیوں افسوس کرتا ہے۔ ابد اور ازل میرے ہی ضمن میں ہیں اور میری کوئی انتہا نہیں ہے

بگوش من رسید از دل سرودے کہ جوئے روزگار از چشمہ سارم
ازل تاب و تب دیرینۂ ما ابد از ذوق و شوق انتظارم
میندیش از کف خاکے میندیش بجان تو کہ من پایاں ندارم

من کی دُنیا میں فنا کا گزر نہیں۔ انسان موت کے غم میں اسی لئے گھُلا جا رہا ہے کہ وُہ اپنی اصلیت کو پیکرِ خاکی پر منطبق کرتا ہے۔ جب تک ہم اپنی حقیقت سے واقف نہ ہو جائیں اِس غمِ مرگ سے نجات ممکن نہیں ؎

تیری نجات غمِ مرگ سے نہیں ممکن   کہ تُو خودی کو سمجھتا ہے پیکرِ خاکی

انسان اگر اپنی خودی کی نگہداشت کرے تو مرنے کے باوجود زندہ رہتا ہے یہ چاند ستارے اور کائنات فنا ہو جائیں گے لیکن خودی کا نشہ وُہ ہے جو ابد تک نہیں اُترے گا ؎

مہر و ستارہ مثالِ شرارہ یک دو نفس   مئے خودی کا ابد تک سرُور رہتا ہے

خودی جب پختہ ہو جائے تو موت سے پاک ہوتی ہے جس نے اپنی خودی کو مستحکم کر لیا اُسے آنے والی موت کا کوئی ڈر نہیں ہوتا ؎

ازاں مرگے کہ می آید چہ باک است   خودی چُوں پختہ شد از مرگ پاک است

اقبالؒ نے بارہا یہ نکتہ سمجھایا ہے کہ انسان کی تمام برائیوں کی جڑ خوف اور خصوصًا موت کا خوف ہے خوف اور اُس کی وجہ سے پیدا ہونے والی ناامیدی کو وہ "اُمّ الخبائث" کہتے ہیں ڈر سے کانپنے والے اور نڈر دلوں کا اُنہوں نے اکثر مقابلہ کیا ہے اور بتلایا ہے کہ نڈر انسان شیر کو بھی بکری سمجھ کر اُس کے مقابلے کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ اور ڈرپوک شخص ہرن سے بھی ایسا بھاگتا ہے گویا شیر اسکے تعاقب میں ہے اگر ہمارے دل میں خوف کا کوئی شائبہ نہیں تو سمندر کو بھی ہم صحرا کی

طرح بے کھٹکے پار کرسکتے ہیں لیکن اگر ہم خوف و ہراس سے مغلوب ہیں تو سمندر
کی ہر موج میں ہم کو مگر مچھ دکھائی دیتا ہے ؎

دلِ بے باک را ضرغام رنگ است — دلِ ترسندہ را آہو پلنگ است
اگر بیمے نداری بحر صحرا است — اگر ترسی بہر موجش نہنگ است

شہنشاہ عالمگیر کی بے باکی تاریخ ہند میں مشہور ہے موت کو وہ خاطر میں نہ
لاتا تھا چنانچہ ایک مرتبہ محاصرہ گولکنڈہ کے زمانہ میں جب ظہر کی نماز کا وقت
آیا تو فصیل کے سامنے مغل فوج صف باندھ کر نماز میں مشغول ہوگئی قلعہ کی دیوار
سے قطب شاہی تیر اندازوں نے یکے بعد دیگرے کئی اماموں کو نشانہ اجل بنایا تو پہلی
صف میں سے کوئی دوسرا شخص امامت کے لئے بڑھنے سے جھجکنے لگا۔ عالمگیر
جو اسی صف میں کھڑا تھا فوراً آگے بڑھ گیا اور حضور قلب کے ساتھ امامت
کرنے لگا یہ جوش اور نڈر پن بھی ایک خصوصیت تھی جس کے باعث ہمارے اسلاف
نے جہانگیری کی۔ اقبال اسی بے خوف زندگی کی طرف ہمیں واپس لانا چاہتے ہیں
وہ خداوند کریم کا وعدہ یاد دلاتے ہیں کہ اللہ پر بھروسہ کرنے والوں کے لئے کوئی
ڈر نہیں جس کے دل میں ایمان کی قوت ہو وہ حضرت موسیٰ کی طرح فرعون سے مقابلہ
کرنے کے لئے تیار ہو جاتا ہے۔ خوف کا ڈر عمل کا دشمن ہے یہ ڈر ہماری زندگی
کے قافلے پر چھاپا مارتا ہے۔ اس سے ہمارے محکم ارادے بھی متزلزل ہو جاتے ہیں
اور ہماری بلند ہمت اندیشوں سے گھر جاتی ہے جب اس ڈر کا بیج ہماری طبیعت

میں بو یا جاتا ہے تو زندگی کی نشو و نما رک جاتی ہے۔ اس سے ہمارے دلوں میں لرزہ اور ہمارے ہاتھوں میں رعشہ پڑ جاتا ہے ہمارے پاؤں سے طاقت رفتار اور ہمارے دماغ سے فکر کی قوت سلب ہو جاتی ہے جب دشمن ہم کو خوفزدہ دیکھتے ہیں تو شاخ گل کی طرح توڑ کر ہم کو باغ سے پھینک دیتے ہیں۔ ان کی تلوار زیادہ قوت کے ساتھ ہمارے سر پر پڑتی ہے اور ان کی نگاہ خنجر کی طرح ہمارے سینہ میں گھس جاتی ہے۔ ہمارے دل کی تمام برائیاں خوف کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں۔ مکاری کینہ اور جھوٹ خوف کی فضا میں پرورش پاتے ہیں اور خوف کے دامن میں ریاکاری اور فتنے پلتے ہیں جس کسی نے دین الٰہی کی رمز کو پہچانا ہے وہ سمجھتا ہے کہ اصل شرک خوف میں مضمر ہے۔ اسی لئے جو شخص شرک سے پاک ہونا چاہتا ہے اس کو چاہئے کہ خوف غیر اللہ اور خصوصاً خوف مرگ کو دل سے دور کر دے۔ شان قلندری یہی ہے کہ ہم غم زندگی سے بے نیاز ہو جائیں ورنہ یہ غم ہماری جان کو زہر کی طرح کھا جاتا ہے۔

ہمہ زندگی بہ غم زندگی غم زندگی سم زندگی
غم ہم نہ کر کہ غم نہ کھا کہ یہی ہے شان قلندری

جو دل رمز حقیقت سے آگاہ ہے اس کو موت کی کچھ پروا نہیں ہوتی کیونکہ وہ جانتا ہے کہ رات کی یہ خاموشی ہنگامہ فردا کو اپنی آغوش میں لئے ہوئے ہے

موت کی لیکن دل دانا کو کچھ پروا نہیں — شب کی خاموشی میں جز ہنگامہ فردا نہیں

مرد حق کی نشانی یہ ہے کہ موت کا ہنسی خوشی استقبال کرے اسکا ثبوت اقبال کے

خود اپنی مثال سے بھی دیا ہے مرتے وقت اپنا یہ شعر اُن کی زبان پر تھا ؎

نشانِ مردِ حق دیگر چہ گویم ۔۔۔ چو مرگ آید تبسم بر لبِ اوست

حج بیت اللہ سے فارغ ہو کر ایک قافلہ مدینہ منورہ کی زیارت کو جا رہا تھا کہ وہ راستے میں رہزنوں کا شکار ہو جاتا ہے۔ ایک زائر کے سوا باقی تمام شرکائے قافلہ قتل ہو جاتے ہیں اس مردِ صادق کے تاثرات آپ بھی سن لیجئے جو اس حادثے کے باوجود تن تنہا یثرب کی طرف چلا جاتا ہے ؎

قافلہ لُوٹا گیا صحرا میں اور منزل ہے دور ۔۔۔ اس بیاباں یعنی بحرِ خشک کا ساحل ہے دور

اُس بخاری نوجواں نے کس خوشی سے جان دی ۔۔۔ موت زہراب میں پائی ہے اُس نے زندگی

خنجرِ رہزن اُسے گویا ہلالِ عید تھا ۔۔۔ ہائے یثرب دل میں لب پر نعرۂ توحید تھا

خوف کہتا ہے کہ یثرب کی طرف تنہا نہ چل ۔۔۔ شوق کہتا ہے کہ تو مسلم ہے بیباکانہ چل

خوفِ جاں رکھتا نہیں کچھ دشت پیمائے حجاز ۔۔۔ ہجرتِ مدفونِ یثرب میں یہی پنہاں ہے راز

گو سلامت محملِ شامی کی ہمراہی میں ہے ۔۔۔ عشق کی لذت مگر خطروں کی جانکاہی میں ہے

آہ یہ عقلِ زیاں اندیش کیا چالاک ہے ۔۔۔ اور تاثر آدمی کا کس قدر بیباک ہے

کوئی قوم اُس وقت تک زندہ نہیں رہتی اور معرکۂ حیات میں نہیں پنپتی جب تک کم از کم اس کے ممتاز ترین افراد میں جاں نثاری اور سرفروشی کا جذبہ اس قدر نہ ہو کہ وہ قوم کی خاطر ہر قسم کے ایثار و قربانی کے لئے تیار رہیں اقبال کے نزدیک ساری داستانِ حرم صرف اس قدر ہے کہ اُس کا

دیباچہ تذکرہ اسماعیلؑ ہے جو خدا کی بارگاہ میں اور اُسکے حکم پر اپنی جان قربان کرنیکے
لیئے تیار تھے۔ اور اُس کا خاتمہ ذکر حسینؑ ہے جنہوں نے حق و صداقت کے
لیئے سب کچھ نثار کر دیا ؎

غریب و سادہ و رنگین ہے داستانِ حرم ۔۔۔ نہایت اسکی حسینؑ ابتدا ہے اسماعیلؑ

قوم کے پودے کی آبیاری دریا کے پانی سے نہیں بلکہ اُس خون سے ہوتی
ہے جو شہیدوں کے سینہ سے نکلتا ہے ملت کی آبرو اُس پیالے میں جھلکتی ہے جس
میں خونِ شہدا بھرا ہوا ہے یہ خون قدر و قیمت میں حرم سے بڑھ کر ہوتا ہے اس
لیئے اقبالؒ شہیدوں کی تربت پر لالہ کے پھول نچھاور کرتے ہیں ؎

سرِ خاکِ شہیدے برگ ہائے لالہ می پاشم ۔۔۔ کہ خونش با نہالِ ملتِ ما سازگار آمد

عرب کی ایک لڑکی فاطمہ طرابلس کی جنگ میں غازیوں کو پانی پلاتی ہوئی شہید
ہوتی ہے۔ تو اُس بے تیغ و سپر جہاد کرنیوالی کو وہ "آبروئے اُمتِ مرحوم" کا لقب
دیتے ہیں اگرچہ فاطمہ کے غم میں اُنکی آنکھ آنسو بہا رہی ہے لیکن اُن کے نالۂ ماتم
میں نغمۂ عشرت بھی موجود ہے کیونکہ وہ دیکھتے ہیں کہ جس باغ کو خزاں نے اُجاڑ دیا
تھا اور جس کے متعلق یہ سمجھ لیا تھا کہ اس میں اب کوئی پھول کھل نہیں سکتا
اس میں ابھی کلی بھی موجود تھی جس راکھ کو مدت سے افسردہ سمجھا جا رہا تھا اس
میں ابھی ایسی چنگاریاں بھی باقی ہیں جن بادلوں کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ وہ مدت
ہوئی برس چکے اُن میں ابھی بجلیاں سو رہی ہیں ؎

اپنے صحرا میں بہت آہو ابھی پوشیدہ ہیں   بجلیاں برسے ہوئے بادل میں بھی خوابیدہ ہیں

زندگی اور موت کی حقیقت "جاوید نامہ" میں سلطان ٹیپو کی زبانی دریائے کاویری کو سنائی ہے۔ زندگی اصل حقیقت ہے، موت ایک فریب اور دھوکا ہے۔ غلام کی موت کے خوف سے زندگی حرام ہو جاتی ہے لیکن بندہ آزاد کے لئے موت ایک لمحہ سے زیادہ نہیں۔ موت سے اس کو نئی زندگی ملتی ہے۔ اگرچہ ہر موت مومن کے لئے خوش آیند ہے لیکن حسینؑ ابن علی کی موت کچھ اور ہی شان رکھتی ہے ؎

ہر زماں میرد غلام از بیمِ مرگ	زندگی او را حرام از بیمِ مرگ
بندۂ آزاد را شانے دگر	مرگ او را می دہد جانے دگر
او خود اندیش است مرگ اندیش نیست	مرگِ آزاداں ز آنے بیش نیست
گرچہ ہر مرگ است بر مومن شکر	مرگِ پورِ مرتضیٰ چیزے دگر
جنگِ شاہانِ جہاں غارتگری است	جنگِ مومن سنتِ پیغمبری است
کس نداند جز شہید ایں نکتہ را	کو بخونِ خود خرید ایں نکتہ را

غرض موت صرف بے غیرتی کی زندگی کا نام ہے۔ عزت اور آبرو کی زندگی میں سر کھونا ہی بقائے دوام سے کم نہیں۔ شیر کی زندگی کا ایک لمحہ بکری کی عمر کے سو سال سے زیادہ ہے۔ سمندر کی موجوں سے ایک گھڑی مقابلہ کرنا اور اسکے مقابلے میں فنا ہو جانا ہزار برس ساحل پہ آرام کی زندگی سے خوشتر ہے۔

زندگی چاہے مختصر ہو لیکن کام کی ہو۔ خضر کو اپنی عمر دراز میں زندگی کی کوئی لذت

حاصل نہیں لیکن پروانہ کو ایک پل بھر شمع کے گرد طواف کرنے میں حقیقی سرور نصیب ہوتا ہے ؎

شنیدم در عدم پروانہ میگفت | دمے از زندگی تاب و تبم بخش
پریشاں کن سحر خاکسترم را | ولیکن سوز و ساز یک شبم بخش

اسطرح اگرچہ ہماری دنیوی زندگی صرف ایک لمحہ رہیگی لیکن ہمیں تب و تاب جاودانہ حاصل ہوگا۔ کام زیادہ اور وقت تھوڑا ہے۔ فرصت عمل دم بھر سے زیادہ نہیں اس لیے جو کچھ کرنا ہے ابھی کرنا چاہیئے نپولین کے مزار پر کھڑے ہوئے اقبالؒ سوچتے ہیں کہ اگرچہ اب یہ آرام سے سو رہا ہے لیکن ایک وقت وہ تھا کہ اُس نے دنیا میں ہلچل مچا دی تھی اس مزار پر کھڑے ہوئے وہ موت کا راز کھول کر بیان کرتے ہیں۔ اور ہمارے لیئے زندگی اور عمل کا پیغام چھوڑ جاتے ہیں ؎

راز ہے راز ہے تقدیر جہانِ تگ و تاز | جوشِ کردار سے کھلجاتے ہیں تقدیر کے راز
جوشِ کردار سے شمشیرِ سکندر کا طلوع | کوہ الوند ہوا جس کی حرارت سے گداز
جوشِ کردار سے تیمور کا سیلِ ہمہ گیر | سیل کے سامنے کیا شئے ہے نشیب اور فراز
صفِ جنگاہ میں مردانِ خدا کی تکبیر | جوشِ کردار سے بنتی ہے خدا کی آواز
ہے مگر فرصت کردار نفس یا دو نفس | عوض یک دو نفس قبر کی شب ہائے دراز

"عاقبت منزلِ ما وادیٔ خاموشان است
حالیا غلغلہ در گنبدِ افلاک انداز!"